ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

رشید امجد کے افسانوں میں "فرد کی شناخت" تحقیقی و تنقیدی جائزہ

A Research and Critical Analysis of “Identity of the Individual” in Rasheed Amjad’s Short Stories

ساجد ندیم

پی ایچ ڈی سکالر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Sajid Nadeem

ranasajidnadeem@gmail.com

ڈاکٹر پروین کلو

ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Dr.Parveen Kallu

drparveenkallu@gcuf.edu.pk

Abstract:

This essay explores the concept of individual identity in the symbolic fiction of Rasheed Amjad, a prominent Urdu short story writer known for his innovative style. While acknowledging the social nature of humanity, the essay argues that each person possesses a unique internal essence that shapes their identity. This internal self clashes with external forces such as societal pressures and existential questions, creating a complex struggle for self-definition. Rashid Amjad's symbolic narratives provide a rich tapestry for examining this internal vs. external conflict. Readers encounter characters grappling with the dissonance between their inner desires and the expectations of their social circles. Additionally, the influence of Sufism, a mystical Islamic tradition, adds another layer of complexity, posing profound questions about our place in the universe.

Through an analysis of Rashid Amjad's fictional characters, the essay will identify the internal elements that contribute to identity, such as psychology, habits, and emotions. Furthermore, it will examine the external forces that shape individuals, including social norms, regional influences, and broader societal and global concerns.

Keywords: Rasheed Amjad, Identity of Individual, Symbol, Fiction, Social, Intrinsic, Personality,influence, Instinct

کلیدی الفاظ: رشید امجد، فرد کی شناخت، علامت، افسانے، معاشرتی، اندرونی، شخصیت، اثرانداز، جبلت

رشید امجد 5 مارچ 1940 ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے۔اور 3 مارچ 2021 ء کو راولپنڈی میں وفات پائی۔رشید امجد 60 ء کی دہائی میں آنے والی کھیپ کا ایک توانا صاحب اسلوب اور بالغ نظر افسانہ نگار ہے اور علامتی افسانے کا انتظار حسین، سجاد انور کے سلسلے کا تیسرا بڑا افسانہ نگار ہے، جس نے ان دونوں ادیبوں کی نسبت نئے افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد پر اپنے فکری اور اسلوبیاتی اثرات مرتسم کیے ہیں۔ان کے افسانوں میں ملکی قومی مسائل، حکومت کے جبری رویے، مارشل لاء کے اثرات اہم موضوع تھے جن سے معاشرتی صورتحال میں خوف، بے یقینی کی فضا پیدا ہوتی تھی۔ان کی کہانیوں میں فرد کے باطن اور ظاہر کی کشمکش، فرد اور اجتماعیت کی کشمکش اور تصوف کی وجودی جہت نظر آتی ہے ۔رشید امجد کے افسانہ نگاری کی ابتدا معاشرتی مسائل سے متعلق واقعات پر مشتمل ہے پھر فرد کے وجودی اثرات ان کی کہانیاں میں نمایاں نظر آنے لگے۔جس کے بعد ان کی کہانیوں میں فلسفیانہ بحث ملتی ہے۔رشید امجد کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'بیزار آدم کے بیٹے '1974ء میں شائع ہوا، لیکن اس سے تقریباً 15 سال قبل ان کے مختلف افسانے مختلف رسالوں میں چھپتے رہے۔

رشید امجد کی پہلی کہانی "سنگم "ان کے بقول 'ادب لطیف 'ستمبر 1960 میں شائع ہوئی۔کچھ تعطل کے بعد 1974 ءمیں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "بے زار آدم کے بیٹے" شائع ہوا۔"ریت پر گرفت "جنوری 1978 ء،"سپہر کی خزاں میں" 1980 ء،'پت جھڑ میں خود کلامی' اپریل 1984ء،" بھاگے ہیں بیاباں مجھ سے" 1988 ء،"دشت نظر سے آگے"(کلیات) 1991 ء،"دشت خواب" 1993 ء،"کاغذ کی فصیل"1993 ء،"عکس بے خیال"1993 ء،"گمشدہ آواز کی دستک"1996 ء،"ست رنگے پرندے کے تعاقب میں"2002ء"ایک عام آدمی کا خواب"جولائی 2006 ء، جیسے مجموعوں نے ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کی۔

رشید امجد کے افسانوں میں جس چیز کا شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے منافقانہ طرز زندگی سے شدید نفرت ہے اور اس نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے میں معاشرے کے بیشتر ایسے افراد کو روشناس کروایا ہے جن کے چہروں پر ماسک تھے۔ان کی کہانیوں میں افراد کے دکھ چھپے نہیں رہتے بلکہ برہنہ ہو کر سامنے آتے ہیں، منافقت پردہ کے پیچھے نہیں رہتی بلکہ سامنے آجاتی ہے ان کی کہانیوں کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے دکھوں کے بیان سے گریز کرنے کی بجائے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے بات کی۔یہی انداز تحریر ان کو ہم عصر افسانہ نگاروں سے ممتاز اور ممیز کرتا ہے۔بقول ساجدہ شاہین:

> "رشید امجد ایسا علامتی افسانہ نگار ہے جس نے اس کی زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں طبقاتی تضادات کی حیرت انگیز صداقتوں اور معاشرے میں ان غلاظتوں سے اپنے افسانوی کے موضوعات اخذ کیے ہیں جن کو اکثر لوگ عام گھٹیا سمجھ کر نظر بچا کر گزر جاتے ہیں "(1)

رشید امجد کے ہاں چیزوں کے سمٹنے کا عمل کئی پرتوں اور معنویت کی کئی جہتوں میں نظر آتا ہے فرد، معاشرہ، تہذیب اور تاریخ اس اس عمل کو بار بار ہوتا دکھاتے ہیں ان کے اس تاریخی شعور کے پیچھے آج کے فرد کی ذات کی شکستگی اور مرکزی وحدت کے گم ہونے کی آوازیں صاف سنائی دیتی ہیں ان کی کہانیوں میں معاشرے کی سمت گم ہوئی دیکھی جاتی ہے جس کی وجہ سے معاشرہ میں منافقت، منافرت اور خوف جنم لیتا ہے۔رشید نثار لکھتے ہیں:

> "انسانی تضادات کا مسئلہ اس کے افسانوں میں قدم قدم پر ملتا ہے ہوا اور جنگل کے ستارے خوف ، نفرت، سنگ دل، خود پرستی اور بے سمتی کی نشاندہی کرتے ہیں چنانچہ رشید امجد نے ان ستاروں کو انسانی تضاد کے احساس اور ایک نئی وحدت کی تخلیق کی صورت میں برتا ہے "(2)

آج کے فرد کا سماج میں زوال پذیر ہوناہر دور کے فرد کی عکاسی کرتا ہے جس میں اس کی راہیں پیچیدہ اور ماحول پر اسرار خوف سے رچا بسا ہوا ہے اس کے علاوہ فرد اندرونی اور بیرونی دونوں سطح پر ایک مخمصے میں مبتلا ہے مگر احساس کی اس پیچیدگی میں بھی رشید امجد راہ گم نہیں کرتے بلکہ انھوں نے بعض خرابیوں کی بڑی ہنر کاری کے ساتھ شناخت کروائی۔روح کی کسک اور تباہی نے اس سے بہت اچھے افسانے بھی لکھوائے ہیں وہ ان افسانوں میں صداقت کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کے بھی متلاشی نظر آتے ہیں۔

> "میرا وجود ساری بس میں چھا جاتا ہے بس کے اندر ہر چیز اس میں سما جاتی ہے اب میں سڑک پر دوڑ رہا ہوں کٹے موٹے زخمی میدان تیزی سے پیچھے رہ رہے ہیں چاروں اور دور دور تک زمین بنجر اور ویران ہے اکا دکا درخت بھی نظر آرہا ہے میرا وجود اب سڑک کی گرفت سے نکلنے کے لیے جدو جہد کر رہا ہے۔لیکن دونوں کنارے مجھے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں کناروں کے ساتھ ساتھ کئی میلوں تک بھاگتا چلا جا رہا ہوں دفعتاً ایک طرف کا کنارہ کچھ ٹوٹا ہوا محسوس ہوتا ہے میں سمٹ کر جلدی سے اس راہ سے باہر نکل جاتا ہوں اور تیزی سے پھیلنے لگتا ہوں اب کوئی حد بندی نہیں میں پورے میدان پر چھا رہا ہوں چٹیل پن ختم ہو رہا ہے اور اس کی جگہ گھنا لہلہاتا جنگل ابھر رہا ہے میرا وجود پھر سمٹنے لگتا ہے "(3)

تہذیبی سفر کے حوالے سے رشید امجد کا افسانہ 'سمندر قطرہ سمندر' طویل منظر نامے میں اجتماعی لاشعور کی نمائندگی کرتا ہے یہ سفر سماج کے بے چین فرد کو بے سکون اور منتشر کرتا ہے اور تاریخ کے طویل عمل کی علامت بنتا ہے پس منظر میں ٹیکسلا جو کہ بنجر اور چٹیل میدانوں پر مشتمل ہے افسانہ نگار کی شعور میں وہ کبھی جنگل اور درختوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا ۔یوں افسانہ نگار حال، ماضی میں گم ہو جاتا ہے تہذیب کے مٹنے کی تصویر کشی بہترین انداز میں اس کہانی میں ملتی ہے کہانی میں ایک تہذیب جو علم و حکمت کا گہوارہ ہو اور اس عمل کے گم ہونے سے اس کی شناخت کی موت بنتا ہے یوں وہ اس تلاش و جستجو میں فرد کی شخصیت کی تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو

"اور جس نے یہ دعوی کیا کہ میں نے اس کو حقیقتاً پہچان لیا ہے۔اس نے اپنے وجود کو معروف کے وجود سے بھی زیادہ عظیم اور بزرگ تر کر لیا، کیونکہ جو شخص کسی چیز کو اس کی حقیقت کی تہہ تک پہنچ کر پہچان لیتا ہے وہ دراصل اس چیز سے بھی زیادہ قوی ہو جاتا ہے "۔حسین بن منصور حلاج کا یہ قول "طواسین میں درج ہے۔"(4)

فرد کا معاشرے کے ساتھ گہرے تعلق کے سبب فرد معاشرے پر اور معاشرہ فرد پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ جس کی بدولت فرد معاشرے اور معاشرتی عوامل سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا معاشرہ فرد کے اعمال، افعال، اخلاق، کردار اور شخصیت پر اثر انداز ہو کر اس میں مثبت اور منفی رویے پیدا کرتا ہے۔ شناخت کے بحران کو کسی شخص کی زندگی میں غیر یقینی یا الجھن کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ بحران اس وقت ہوتا ہے جب کسی شخص کی شناخت کا احساس غیر محفوظ اور غیر مستحکم ہو جاتا ہے۔شناخت کا بحران عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کسی شخص کی زندگی میں تبدیلی آتی ہے۔ لیکن شناخت کا بحران کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔سماجی لحاظ سے یہ بحران مذہب، رنگ، نسل، جنس اور طبقاتی نظام کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ڈاکٹر رشید امجد کے نزدیک:

"میری شناخت کی دو سطحیں ہیں جن کے اظہار کیلیے میں لکھتا ہوں، اول یہ کہ اس معاشرے میں، عہد کو کیسے بچا سکتا ہوں۔ اس طبقاتی معاشرے میں کیا میری شناخت صرف میرا شناختی کارڈ نمبر ہے، یا میں اس معاشرے میں کہیں اور بھی وجود رکھتا ہوں، یہ میری تحریروں کا سماجی اور سیاسی پس منظر ہے، میں بار بار کیوں فتح کر لیا جاتا ہوں میری رائے کہاں ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے؟ میں اپنی لکھتوں میں اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اسی لیے لکھتا ہوں، لیکن یہ میرے ہونے کا خارجی لمحہ ہے، میری شناخت کا ایک داخلی اور باطنی لمحہ بھی ہے اور وہ یہ کہ میں کون ہوں؟ اس عظیم کائنات میں میرا وجود کیا معنی رکھتا ہے، میں ہوں بھی یا نہیں، یہ دائرہ در دائرہ سچ کا سفر کہاں ختم ہوتا ہے، ایک لمحہ ہے جہاں سرگشتگی اور تحیر کے سوا کچھ نہیں، جو راز ہے وہ راز ہی ہے۔ میں اس لیے بھی لکھتا ہوں کہ یہ راز مجھ پر منکشف ہو جائے اور اس انکشاف سے مجھے جو مسرت و سرشاری ملتی ہے میں اپنے قاری کو اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں اسی لیے تو میں نے خرقہ اتار کر قلم سنبھال لیا ہے کہ سچ کی کوئی زبان، کوئی بھیس لباس نہیں ہوتا۔"(5)

رشید امجد کا افسانہ مجموعی طور پر فرد کی شناخت کا گہرا مطالعہ لیے ہوئے ہے۔انھوں نے معاشرتی و تاریخی شواہدات کی روشنی میں ہر دور کے فرد کا مطالعہ کیا۔ان کے ہاں فرد کی شناخت اس کے تہذیبی و ثقافتی تعلق اور معاشرتی ناہمواریوں کے باعث بدلتی ہوئی نظر آتی ہے۔رشید امجد کا مشاہدہ عہد جدید کے تقاضوں کے مطابق ہے۔انھوں نے مشینی دور کے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معاملات کو موضوع بنا کر اس دور کے فرد پر بین الاقوامی اثرات کو بھی قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔جدید عہد میں فرد اپنی شناخت شعوری طور پر بھی تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نئی نسل کے افراد میں اب مقامی تہذیب سے باہر نکلنے کا جذبہ بدرجہ اتم ہے۔ان کا رہن سہن اور وضع قطع شعوری طور پر اپنے آپ کو بین الاقوامیت کے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔رشید امجد بھی اسی دور دور کے ادیب ہیں جہاں یہ تبدیلیاں اپنے ابتدائی ایام میں تھیں۔

بگل والا: سرکاری عہدوں اور وقتی مقام و مرتبے پر شخصیت کی شناخت قائم کرنے والے معاشرے کی ایک بہترین مثال رشید امجد کے افسانے "بگل والا" میں ملتی ہے۔ایک ایسا فرد جو اپنی عارضی حیثیت کو منوانے کے لیے خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے اور خود کو معاشرے کا اعلیٰ فرد سمجھتا ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ لوگ اس کے اشارے پر چلتے ہیں۔یہ مغالطہ معاشرے کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار فوج میں بگل بردار ہوتا ہے۔وہ جب بگل بجاتا ہے تو کمانڈنٹ سے لے کر عام سپاہی تک اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور پریڈ گراؤنڈ میں حاضر ہو جاتے ہیں۔وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ پلٹن کے عام افراد اس کے حکم کے تابع ہیں اور اپنے سے منسلک افراد کو اپنے بگل کی اہمیت بارہا جا گر کرواتا رہتا۔اقتباس ملاحظہ ہو:

وہ اپنی بگل کو تھپتھپاتا "پوری پلٹن کیا، ساری چھاونی اس کی ماتحت ہے۔"
اب بیوی کی آنکھوں میں خاوند کے لیے ایک سرشاری کی نمی سی آجاتی۔۔۔۔
واقعی وہ سچ ہی کہتا ہوگا اور اسے بگل والے کی بیوی ہونے پر ایک فخر کا سا احساس ہوتا۔ (6)

دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

بگل والا کبھی کبھی اپنے دوستوں سے بھی کہتا۔۔۔۔۔یہ بگل نہیں اس کی آواز میں اک جادو ہے اور اس جادو کا جادو گر میں ہوں۔اس کا سینہ پھول جاتا۔۔۔۔۔اس کی آواز پر تو کمانڈنٹ بھی اپنے بستر کی گرمی چھوڑ کر گراؤنڈ میں آ جاتا ہے۔ (7)"

اس بگل بردار کی خوش فہمی اس وقت غلط فہمی میں تبدیل ہو جاتی ہے جو ایک سالانہ دربار میں اس کی بیوی بن ٹھن کر جاتی ہے۔اس کے ذہن میں ایک تفاخرانہ سوچ تھی کہ اس کے خاوند کا حکم پوری پلٹن میں چلتا ہے۔ چنانچہ وہ دربار میں لگی ہوئی کرسیوں کی پہلی قطار میں جا بیٹھتی ہے۔جب فوج کے اعلیٰ افسران کی بیویاں دربار میں آتی ہیں تو بگل والے کی بیوی کو پہلی قطار سے اٹھا کر آخری قطار میں بٹھا دیا گیا۔اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تفاخرانہ خیال چکنا چور ہو گیا۔اسے اپنے خاوند کے عہدے ''بگل دار'' پر بڑا فخر تھا۔وہ اس عہدے پر اپنی شخصیت کی شناخت قائم کرنا چاہتی تھی۔جب اسے انتظامیہ نے تعارف کروانے کے لیے کہا تو بڑے فخر سے بتایا کہ ''مسز بگل دار''۔

"مسز کے معنی اسے معلوم تھے،اس نے کہا، ''بگل دار۔''
اس نے اپنی طرف سے بگل دار پر بہت زور دیا تھا لیکن سننے والا
ذرا متاثر نہ ہوا بلکہ اس کے چہرے پر ایک کرختگی آ گئی،آپ پیچھے آ جائیں۔۔۔۔
یہ کمانڈنٹ صاحب کی بیگم اور ان کے مہمانوں کی نشستیں ہیں۔"(8)

بگل بردار کی بیوی ہمارے معاشرے کا وہ فرد ہے جو وقتی طور پر کسی آسائش یا عہدے کے میسر آ جانے پر خود کو ایک اعلیٰ مخلوق سمجھنے لگتا ہے۔فرد کی اصل شناخت اس کی بنیاد ہے جس پر اس کی ہستی قائم ہے۔اس کا اپنی ذاتی کردار ہے جو اسے دوسروں سے منفرد بناتا ہے۔

''ایک عام آدمی کا خواب'' بھی اسی ضمن میں ایک اچھی کہانی ہے۔یہ ایک ایسے فرد کی کہانی ہے جو اپنی شخصیت کی پہچان اور شناخت کے لیے ہمیشہ اخبارات میں بڑی خبروں کا متلاشی رہتا ہے۔اس کے لیے وہ اپنی قیمتی وقت صرف کرتا ہے۔مختلف قسم کے اخبارات کے حصول کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ٹیلی ویژن پر بار بار چینل تبدیل کرتا ہے۔اس کے دل میں یہ بھی خیال ایک خواہش کی طرف قائم رہتا ہے کہ کبھی میرا نام بھی اخبار میں چھپے گا۔اسی خواہش میں وہ مر جاتا ہے تو اس کے بعد اس کی رسم قل کی ادائیگی کی خبر لگتی ہے۔یوں اس کا نام اخبار کی زینت بن جاتا ہے لیکن اسے دیکھنے کے لیے وہ خود زندہ نہیں رہتا۔اقتباس ملاحظہ ہو:

"ایک دن اچانک سانس کی تکلیف بڑھ گئی۔ریموٹ اس کے ہاتھوں ہی میں رہ گیا اور آنکھیں چپکے سے بند ہو گئیں اس کے بیٹے نے اپنے کسی دوست کو کہہ کر اخبار میں خبر لگوا دی۔"(9)

عہد جدید کے ادب میں فرد کا مطالعہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔اردو افسانے میں بھی زیادہ تر کہانیاں ایک انسان کی سوچوں،اس کی پہچان اور شناخت کے مرکزی سوالات کے گرد گھومتے ہیں۔اجتماعیت کا سوال ناپید ہو چکا تھا۔تاہم رشید امجد نے فرد کے ساتھ ساتھ اجتماعیت کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا۔انہیں اس بات کا احساس رہتا تھا کہ فرد کی ذات میں تحقیق کی چھلانگیں لگانے کے علاوہ بھی معاشرے میں مشاہدے کے لیے بہت کچھ باقی ہے چنانچہ وہ اپنے افسانے ''بے چہرہ آدمی'' میں انفرادیت کے بدلے میں مفاد پرستی کے زور پر طنز کرتے ہیں۔لکھتے ہیں:

"صداقت یہی ہے نا،ہر انسان اپنے مفاد کے لیے جو کچھ کہتا ہے وہ سچ ہے،ہے نا؟''
لیکن اس نے سر جھٹک کر چیزوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔
''لیکن سچائی سڑک پر پڑی ہوئی کوئی شے بھی تو نہیں۔"(10)

رشید امجد نے فرد کی ذات کے چکر کاٹنے والے ادیبوں کو بھی دعوت دی ہے کہ انفرادیت کے ساتھ ساتھ اجتماعیت کے مسائل پر قلم اٹھائیں۔ان کے نزدیک ہر قسم کے موضوعات اور ہر طبقے کا مشاہداتی مطالعہ ضروری ہے۔ایک فرد کی ذات کے سوالات کا جواب معاشرے کی اجتماعیت سے بھی مل سکتا ہے۔معاشرے میں ظلم و جبر کی اجتماعی داستانیں رقم ہو رہی ہوں تو فرد واحد پر اس کے بلاواسطہ اثرات مرتب ہوں گے۔چنانچہ فرد کی شناخت کے لیے معاشرے کے مجموعی رویے پر توجہ کرنا بھی ضروری ہے۔رشید امجد کا افسانہ اگرچہ کہانی پن سے زیادہ فلسفے کے مضمون کا روپ دھارتا ہوا محسوس ہوتا ہے تاہم ان کی بات داخلیت اور انفرادیت کے دور میں قابل توجہ ہے۔لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

"انفرادیت سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ "دوسرے نے غرا کر پوچھا۔۔۔
"یہ کہ معاشرے سے آنکھیں بند کر کے نام نہاد ذات کے کنویں میں ڈبکیاں
لگاتے رہیں اور ہر ڈبکی پر ریت اور کنکروں کی ایک مٹھی نکال کر پڑھنے والوں
کے منہ پر دے ماریں۔۔۔ یہ ہے تمہاری انفرادیت۔"(11)

اس کہانی میں مصنف سچائی کی تلاش میں انفرادی جوابات کو تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے کہ انفرادیت کی وجہ سے ہر فرد سچائی اور صداقت کو اپنی نظر کی عینک سے دیکھتا ہے۔اور ہر فرد دوسرے کی پیٹھ کے پیچھے بات کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مصنف نے تنقیدی لمحہ میں اس وقت کے سیاسی، سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہوئے آنے والے وقتوں کی حقیقت کو بھی اجاگر کیا ہے کہ سچ، مال وزر کے عوض بیچا جاتا ہے۔ دولت سچائی کا رخ تعین کرتی ہے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"ہاں، یہاں تو ہاتھ کھڑا کرنا اور ہاتھ کھڑے کروانا ایک کاروبار بن چکا ہے۔
اور کاروبار کے لیے کھنکتے اور چمکتے سونے کی ضرورت ہے اور یہ کھنکتا، چمکتا
سونا ان کے پاس نہیں جو سچ کو تلاش کرنا چاہتے ہیں۔"(12)

غلام عباس کا افسانہ "کتبہ"، میراجی کی نظم "کلرک کا نغمۂ محبت" اور راجندر سنگھ بیدی کا "گرم کوٹ" تینوں مل کے نچلے اور متوسط درجے کے نوکری پیشہ آدمی کی محرومی، بے بسی اور اذیت ناکی کی جو مثلث بناتے ہیں وہ اس عدم مساوات پر مبنی دنیا کے کروڑوں افراد کی زندگیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے "ست رنگے پرندے کے تعاقب میں" رشید امجد کی علامتی کہانی بھی اسی پیرائیہ میں ہے۔ ست رنگا پرندہ افسانے کے مرکزی کردار کی ماضی سے منسلک خواہشات کی علامت ہے۔ اس کے دماغ کا پرندہ جب پرواز کرتا ہے تو ست رنگی خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ وہ پرانے وقتوں کی یادوں کا تازہ کرنا چاہتا ہے مگر اس کی بیوی اور بچے ان چیزوں کو اولڈ فیشن سمجھ کر خاطر میں نہیں لاتے۔ اس مرکزی کردار کی رہائش اندرون شہر میں تھی۔ جہاں گھر کے باہر بارونق بازار اور ہر طرح کا رش لگا رہتا تھا۔ اس ہجوم کے ساتھ ہی وہ بڑا ہوا تھا۔ ساری زندگی رونق بھری تھی مگر پھر اولاد کی خواہش پر اس نے وہ مکان بیچ کر شہر کے باہر ایک پرسکون کالونی میں گھر بنا لیا۔ اس گھر میں اس کا دل نہیں لگتا اسے ہر بار اندرون شہر کی یاد ستاتی ہے۔ ایک اقتباس میں اس کی کیفیت ملاحظہ کیجیے:

"اسے خیال آیا کہ چند برس پہلے جب وہ بھی اندرون شہر رہتا تھا تو اس کی زندگی بھی اسی طرح لبالب بھری ہوئی تھی، ہر
وقت ایک ہنگامہ، ایک شور، ڈھیر سارے لوگوں کے درمیان، اپنائیت کے گرم لمس کے ساتھ اور اب اس نئی آبادی میں
سکون ہی سکون تھا، خاموشی، اپنے کام سے کام۔ معیار بڑھ گیا تھا لیکن جیسے زمین سے نکل کر گملے میں آ گئے تھے۔"(13)

یہ کہانی افراد کی ماضی کی حسین اور تلخ یادوں پر مشتمل ہے۔ جس میں ہر فرد اپنے مستقبل اور حال میں ذات کی شناخت کے مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ وہ اپنے ماضی کے ساتھ جینا چاہتا تھا مگر اس کی اولاد نئی شناخت قائم کرنے پر بضد تھی۔ وہ مجبور تھا مگر اس کی یادوں کا ست رنگا پرندہ ہمیشہ ماضی کی پرواز میں محو رہتا۔ ایک دن وہ گھر کی چھت پر گیا تو اسے پرانی چارپائی پڑی ہوئی نظر آتی تو دوبارہ سے اس چارپائی پر سجنے والی محفلوں اور رونقوں کا خیال آ گیا۔ چارپائی کی رسیوں پر بیٹھ کر سردیوں کی دھوپ تاپنے کی خواہش بڑھ گئی۔ گھر کے دیگر افراد اسی پرانی چیز کو گھر سے باہر نکالنا چاہتے تھے مگر اس کی خواہش تھی کہ اسے دوبارہ بن کر نئی رنگ و روغن عطا کیے جائیں۔ گھر کے افراد کی شدید مخالفت کے باوجود جب اس نے چارپائی بن لی تو سب کو بہت پسند آئی۔ چارپائی کو سات رنگوں میں بنا گیا اور اسے گھر کے برآمدے میں رکھا گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ست رنگوں کا پرندہ خوشی کا رقص کر رہا ہو۔ سب کو چارپائی کی نئی حالت بہت پسند آئی۔ مگر اس فرد کو چارپائی پر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اسی رات دل کی تکلیف کے باعث اس کا انتقال ہو گیا اور وہ ست رنگی چارپائی اس کی میت اٹھانے کے کام آئی۔

رشید امجد نے اس افسانے کے ذریعے فرد کی شناخت کے تبدیل ہونے کے پورے مرحلے کو بیان کر دیا ہے۔ ایک نسل سے تعلق رکھنے والا شخص اپنی شناخت اپنے ماضی کے ساتھ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کی رونق، محفل اور میل جول کی زندگی چاہتا ہے۔ یہ میل جول اور قوانین افراد کے رویوں پر کیسے اثرانداز ہوتے ہیں اور ان کی شخصیات میں انفرادیت کے بارے میں بھی عمرانیات بتاتی ہے۔ معاشرہ ایک جاندار چیز کی طرح ہے جو حکومتوں کی طرح منظم طور پر اپنے کام کرتا ہے، جس کے ایک حصہ متاثر ہونے سے دوسرے حصے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ معاشرتی اقدار کی اہمیت ارسطو کے اس بیان سے اور بھی قابل غور بن جاتی ہے۔

"Man is a social animal. He who lives without society is either a beast or God"(14)

نئی نسل اپنی شناخت خود تبدیل کر رہی ہے۔اس دور کا فرد رونق اور میل جول سے دور بھاگتا ہے۔اس کے مسائل انفرادی نوعیت کے ہیں۔وہ اپنی ذات سے باہر نکل کر نہیں سوچتا ۔پہلے دور کا فرد انفرادیت پر اجتماعیت کو فوقیت دیتا تھا۔وہ اپنی ذات سے زیادہ اجتماعیت کو اہمیت دیتا تھا۔یہ کلونیل ازم کے اثرات ہیں جہاں سے ہمارے ہاں فرد کی شناخت میں تبدیلی کا آغاز ہوا۔ہر فرد اپنے مسائل خود حل کرنا چاہتا ہے،تنہائی پسند ہے اور محفل سے متنفر ہے۔رشید امجد فرد کی شخصیت کے بیروں بین پہلو کو پیش کر کے ماہر نفسیات کارل گستاؤ ژونگ کے نظریہ Extrovert Person کو تقویت دیتا ہے جس کے نزدیک ایسے افراد معاشرتی یا سوشل ہوتے ہیں جو اپنے بیرونی ماحول اور واقعات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔اس قسم کے افراد ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔اور وہ پر اعتماد اور عمل طور پر متحرک ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ساجدہ شاہین،رشید امجد بحیثیت افسانہ نگار،مقالہ،زکریا یونیورسٹی،ملتان:1982ء،ص ۱۳۹
2۔رشید نثار، رشید امجد کے افسانے ،دسمبر 1969 ،ص299
3۔رشید امجد،ڈاکٹر، سمندر قطرہ سمندر،طبع: اوراق،افسانہ نمبر،1970 ء،ص308
4۔ رشید امجد،ڈاکٹر،عام آدمی کے خواب،اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۰۷ء،ص ۱۵
5۔ ایضاً ص16
6۔ایضاً،ص ۷۱٦
7۔ایضاً،
8۔ایضاً ص ۷۳٦
9۔ ایضاً ص ۷۸٦
10۔ ایضاً ص ۷٦
11۔ ایضاً ص ۷۷
12۔ ایضاً ص ۸۰
13۔ رشید امجد،ڈاکٹر،ست رنگے پرندے کے تعاقب میں،راولپنڈی:حرف اکادمی،2002ء،ص22
14. Aristotle. Aristotle in 23 Volumes, Vol. 21, translated by H. Rackham.Cambridge, MA, Harvard University Press; London, William Heinemann Ltd. 1944.